ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری: جدیدیت کی مابعد الطبیعیاتی شکست اور اسلامی متبادل کا فکری معمار

شیخ جابر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے فکری کارنامے کو محض ایک "تنقیدی بیانیہ" قرار دینا ان کی علمی جلالت اور فکری گہرائی کے ساتھ صریح ناانصافی ہو گی۔ درحقیقت، وہ ایک ایسے عظیم الشان تہذیبی مقدمے کے وکیل تھے جس میں مدعا علیہ پوری جدید مغربی تہذیب تھی اور مدعی وہ انسان جو اپنی ہی تراشیدہ فکری ساختوں اور فلسفیانہ بتوں کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اپنی اصل شناخت کھو چکا ہے۔ ان کی رحلت اس طویل مقدمے کا اختتام نہیں، بل کہ ان کے پیش کردہ دلائل کو مزید سنگین، ناگزیر اور آفاقی بنا دیتی ہے۔ اب یہ سوال تاریخ کے ماتھے پر ایک تازیانے کی طرح ثبت ہے کہ کیا مسلم فکر اس معرکۂ حق و باطل کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے یا ہم محض فکری مرعوبیت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے؟

جدیدیت: ایک مابعد الطبیعیاتی بحران

ڈاکٹر انصاری کی فکر کا نقطۂ آغاز یہ ادراک ہے کہ جدیدیت کا اصل بحران سیاسی، معاشی یا سماجی سطح پر نہیں، بل کہ اس کے تصورِ حقیقت اور تصورِ علم میں پیوست ہے۔ وہ مظاہر کی سطح پر بحث کرنے کے بجائے ان بنیادوں پر ضرب لگاتے ہیں جہاں معنی کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک جدیدیت کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، بل کہ ایک منظم مابعد الطبیعیاتی انحراف ہے۔

مغربی جدیدیت کا وہ فکری سفر جو رینی ڈیکارٹ کے "کوگیٹو" سے شروع ہوا، دراصل ایک ایسے "نئے انسان" کی تخلیق کا نقطۂ آغاز تھا جو خود کو کائنات کا منبع اور مرکز سمجھتا ہے۔ ڈیکارٹ کا مشہورِ زمانہ قول: "میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں" (کوگیٹو، ایرگو سَم) محض ایک فلسفیانہ جملہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک تہذیبی اعلانِ جنگ تھا—ایک ایسا اعلان جس میں "وجود" کو "شعور" کے تابع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری اس مقام کو جدیدیت کی اصل پیدائش

قرار دیتے ہیں، کیوں کہ یہیں سے "خدا مرکز" کائنات ایک "انسان مرکز" کائنات میں تبدیل ہوئی۔ جب انسان کا شعور ہی حقیقت کا معیار بن گیا تو کائنات کی معروضی حقیقت پسِ منظر میں چلی گئی اور "انسانی انا" کو الوہیت کا درجہ مل گیا۔

آزادی: وجودی بغاوت کا فلسفہ

اسی "انسان مرکزیت" کے بطن سے "لبرٹی" کے اس تصور نے جنم لیا جسے بعد ازاں جان لاک، مانٹیسکیو اور ژاں ژاک روسو نے سیاسی و سماجی قالب میں ڈھالا۔ ڈاکٹر انصاری اس آزادی کو ایک نہایت دقیق زاویے سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ آزادی کسی جبر سے نجات کا نام نہیں، بلکہ ایک "وجودی بغاوت" ہے۔ جب انسان خود کو خود مختار قرار دیتا ہے، تو وہ کسی بھی ماورائی حقیقت یا وحی کے پابند رہنے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوں "حق" کوئی معروضی یا الہامی حقیقت رہنے کے بجائے ایک داخلی تعمیر بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری کی تنقید یہاں نہایت بصیرت افروز ہو جاتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ:

"سیلف لیجس لیشن" (خود تشریعت) دراصل "سیلف ڈیفیکیشن" (خدائی کے دعوے) کی ہی ایک جدید صورت ہے۔

یعنی جب انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے قانون سازی کا حق خود رکھتا ہے، تو وہ لاشعوری طور پر خود کو خدا کے منصب پر فائز کر رہا ہوتا ہے۔ لبرٹی یہاں ایک اخلاقی قدر نہیں رہتی، بلکہ ایک مابعد الطبیعیاتی انکار بن جاتی ہے۔ اس انکار کا منطقی انجام وہی "نہیلیت" یا نہیلزم ہے جس کی بازگشت ہمیں فریڈرک نطشے کے ہاں "خدا کی موت" کے اعلان میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے نزدیک نطشے جدیدیت کا دشمن نہیں بل کہ اس کا سب سے صادق ترجمان تھا، کیوں کہ اس نے وہ تلخ سچائی بیان کر دی جس کی بنیاد ڈیکارٹ اور لاک نے رکھی تھی: یعنی اگر خدا مرکزِ کائنات نہیں ہے، تو پھر اقدار کا کوئی مستقل بنیاد نہیں ہو سکتی اور کائنات ایک لایعنیت کا شکار ہو جائے گی۔

ترقی: ایک ٹیلیولوجیکل فریب

جدیدیت کا دوسرا بڑا ستون "پروگریس" یا ترقی کا تصور ہے جسے ایمانوئل کانٹ نے "عقل کی خود مختاری" سے جوڑا اور کارل مارکس نے تاریخی جدلیات کا نام دیا۔ ڈاکٹر انصاری اس تصور کو ایک غایتی فریب (ٹیلیولوجیکل الوژن) قرار دیتے تھے۔ ایک ایسا فریب جس میں تاریخ کو ایک مصنوعی لکیری سمت (لینیر ڈائریکشن) دے دی گئی ہے کہ انسان لازمی طور پر "بہتری" کی طرف جا رہا ہے۔

وہ ایک بنیادی سوال اٹھاتے تھے:

"اگر تاریخ واقعی کسی حتمی خیر (الٹیمیٹ گڈ) کی طرف بڑھ رہی ہے، تو پھر جدید دور میں شر کی اس قدر کثرت اور انسانیت کی تذلیل کو کیسے سمجھا جائے؟"

ڈاکٹر انصاری کی یہ تنقید میشل فوکو اور مارٹن ہائیڈیگر کے بعض پہلوؤں سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے، لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ جدیدیت کی تنقید کے بعد کسی فکری بنجر پن یا لایعنیت کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جسے ہم "ترقی" کہہ رہے ہیں، وہ دراصل مقداری پھیلاؤ ہے، جبکہ انسان کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ معیاری یا روحانی بلندی تھی۔ انسان نے کائنات کو مسخر کرنے کے زعم میں اپنی روح کو کھو دیا ہے۔ اس نے رفتار تو حاصل کر لی، مگر سمت سے محروم ہو گیا۔ یہ ترقی ایک "پیراڈاکس" ہے جہاں ظاہری عروج دراصل باطنی زوال کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

انسانی حقوق اور جمہوریت: سیکولر تھیولوجی کے اوزار

"ہیومن رائٹس" (انسانی حقوق) پر ڈاکٹر انصاری کی تنقید ان کے فکری نظام کا ایک اور اہم باب ہے۔ وہ اسے ایک "سیکولارائزڈ تھیولوجی" قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک حقوق کا تصور تبھی معقول ہو سکتا ہے جب اس کا منبع کوئی "مطلق" حقیقت ہو۔ اگر حقوق کا منبع خود انسان یا اس کی عقلِ نارسا ہے، تو حق "نسبتی" ہو جائے گا۔ اور جو حق نسبتی ہو، وہ کبھی آفاقی

ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مغربی فلسفہ اسی تضاد کا شکار ہے کہ وہ بنیاد تو "فرد کی پسند" پر رکھتا ہے مگر دعویٰ "آفاقیت" کا کرتا ہے۔

اسی تسلسل میں وہ جمہوریت کو محض ایک سیاسی نظام نہیں بلکہ ایک "علمیاتی دعوا" سمجھتے تھے۔ یہ دعوا کہ "اکثریت کے پاس حق کا علم ہے"۔ ان کا چیلنج یہ تھا کہ کیا عددی اکثریت کبھی علمی سچائی کی ضمانت دے سکتی ہے؟ یہاں ان کی فکر افلاطون کی اس تنقید سے ہم آہنگ ہوتی ہے جس میں وہ جمہوریت کو "ہجوم کی حاکمیت" کہتا ہے، مگر ڈاکٹر انصاری اسے اسلامی تناظر میں "حاکمیتِ الٰہیہ" کے مقابلے میں "حاکمیتِ عوام" کے مابعد الطبیعیاتی تصادم کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

سرمایہ داریت: خواہشات کی بندگی کا نظام

سرمایہ داریت ان تمام تصورات کا عملی اور سفاک مظہر ہے۔ ایڈم اسمتھ کے "غیر مرئی ہاتھ" سے لے کر جدید صارفیت تک، یہ نظام ایک ایسے انسان کی تخلیق کرتا ہے جو اپنی شناخت صرف اپنی خواہشات کی تسکین میں تلاش کرتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری اسے "اکنامک رڈکشن ازم" کہتے تھے، یعنی انسان کو صرف ایک "معاشی اکائی" میں تبدیل کر دینا۔ اُن کے نزدیک سرمایہ داریت کی تنقید محض معاشی تفاوت کی تنقید نہیں تھی، بل کہ یہ ایک بشریاتی المیہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سرمایہ داریت انسان کی تعریف ہی بدل دیتی ہے:

- وہ "عبد" نہیں رہتا، بلکہ صارف بن جاتا ہے۔
- اس کا مقصدِ حیات "رضائے الٰہی" کے بجائے افادہ پسندی بن جاتا ہے۔
- اس کی اخلاقیات "ایثار" کے بجائے "مقابلے" پر استوار ہوتی ہیں۔
- جب انسان کی تعریف بدل جائے، تو اس کا شعور اور اس کی پوری کائنات بدل جاتی ہے۔ سرمایہ داریت دراصل "انا" کی پرستش کا معاشی ڈھانچہ ہے۔

اسلامی مابعد الطبیعیات: ایک ہمہ گیر متبادل

ڈاکٹر انصاری کی فکری عظمت کا سب سے درخشاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام جدید تصورات—لبرٹی، پروگریس، حقوق، جمہوریت اور سرمایہ داری—کو الگ الگ خانوں میں نہیں دیکھا، بل کہ انہیں ایک مربوط مابعد الطبیعیاتی نظام (انٹی گریٹیڈ میٹافزیکل سسٹم) کے طور پر بے نقاب کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں جس کی جڑ "سیکولر ہیومنزم" ہے۔ ان کی فکر کا مثبت اور تعمیری پہلو "اسلامی روایت کی بازیافت" ہے۔ مگر یہ بازیافت محض ماضی کی یادوں میں کھو جانا یا "نوستالجیا" نہیں ہے، بل کہ ایک زندہ اور متحرک فکری امکان ہے۔ وہ اسلامی مابعد الطبیعیات کو ایک ایسے نظام کے طور پر پیش کرتے ہیں جہاں:

- حقیقت کا مرکز ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔
- علم کا حتمی منبع وحی الٰہی ہے، جو عقل کو سمت عطا کرتی ہے۔
- انسان کی اصل تعریف "عبدیت" (بندگی) ہے، نہ کہ خود مختاری۔

اس نظام میں "آزادی" کا مطلب نفس کی غلامی سے نجات ہے، "ترقی" کا مطلب سیرت کا ارتقاء ہے اور "حقوق" کا تصور "فرائض" اور "ذمہ داریوں" کے ساتھ مربوط ہو کر ایک متوازن معاشرے کی تخلیق کرتا ہے۔

فکرِ انصاری کی وراثت: ایک دبستان کی تشکیل

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی رحلت کے بعد یہ سوال نہایت اہم تھا کہ کیا یہ فکر ان کی ذات کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی؟ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ ان کی فکر اب ایک فرد سے نکل کر ایک "دبستان" کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

ان کے شاگردوں اور رفقاء نے اس مشعل کو تھاما ہوا ہے۔ سید خالد جامعی صاحب نے جس بے باکی اور عوامی اسلوب کے ساتھ جدید تہذیب کے تضادات کو چوراہے میں لا کھڑا کیا، وہ

اس فکر کی ایک مؤثر عوامی تعبیر ہے جبکہ ڈاکٹر عبد الوہاب سوری نے اسے ایک باقاعدہ علمی مکالمے میں ڈھال کر جامعات اور فکری حلقوں میں اس کی استقامت کو یقینی بنایا ہے۔ یہ تسلسل اس بات کی دلیل ہے کہ انصاری صاحب نے صرف کتابیں نہیں لکھی تھیں، بلکہ ذہنوں کی آب یاری کی تھی۔

حرفِ آخر: وجودی انتخاب کا وقت

ڈاکٹر انصاری کے اٹھائے ہوئے سوالات آج پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ کیا ہم ان کی فکر کو محض ایک "فلسفیانہ تفریح" یا "انٹلکچوئل ایکسر سائز" سمجھ کر اپنی لائبریریوں کی زینت بنائیں گے، یا اسے اپنے وجودی بحران کے حل کے طور پر سنجیدگی سے لیں گے؟

جدید انسان کے پاس معلومات کا انبار ہے، ٹیکنالوجی کا عروج ہے، مگر وہ "معنی" سے محروم ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ "کون" ہے اور "کیوں" ہے؟ ڈاکٹر انصاری کی پوری فکر کا نچوڑ اس ادراک میں ہے کہ جب تک ہم اپنی بندگی کا اعتراف نہیں کرتے، ہم اپنی آزادی کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتے۔

ان کی فکر ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

مسئلہ یہ نہیں کہ دنیا بدل گئی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم نے اس بدلتی ہوئی دنیا کی چکاچوند میں اپنی آنکھیں اور اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کا فکری ورثہ ہمیں اسی "خود شناسی" اور "خدا شناسی" کی طرف واپسی کی دعوت دیتا ہے جو کسی بھی حقیقی "اسلامی انقلاب" کی پہلی اینٹ ہے۔